© rasailojaraid.com



التفسیر والتعبیر

مولانا عزیز زبیدی

# سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ

(قسط ۲۵)

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ

اور (وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب (حضرت موسیٰ) نے اپنی قوم کے لیے پانی کی درخواست کی تو

الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا

ہم نے فرمایا (اے موسیٰ!) اپنی لاٹھی پتھر پر مارو (لاٹھی کا مارنا تھا کہ) اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے

---

۱ اِذْ (جس وقت، کیونکہ، ناگاہ) اس کا استعمال چار طرح پر ہوتا ہے (۱) زمانہ ماضی کا اسم (تام) ہو، اس کی پھر چار صورتیں ہیں۔

۱ اگر بطور ظرف آتا ہے، یعنی ماضی میں فلاں بات ہوئی۔ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲) دوسری صورت یہ کہ وہ مفعول بہ واقع ہو۔ وَاذْكُرُوْا اِذْ كُنْتُمْ قَلِيْلًا قصص کے شروع میں قرآن میں جہاں یہ آیا ہے، وہاں مفعول بہ ہو کر آیا ہے: وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یا وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ یا اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (۳) تیسری شکل یہ ہے کہ وہ مفعول سے بدل ہو جیسے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ اس میں اِذِ انْتَبَذَتْ، مَرْيَمَ سے بدل ہے (۴) چوتھا اس کا رنگ یہ ہے کہ: اسم زماں اس کی طرف مضاف ہو جیسے يَوْمَئِذٍ یا حِيْنَئِذٍ۔ جمہور کے نزدیک یہ صرف ظرف یا مضاف الیہ واقع ہوتا ہے۔ وَزَعَمَ الْجُمْهُوْرُ اَنَّ اِذْ لَا تَقَعُ اِلَّا ظَرْفًا اَوْ مُضَافًا اِلَيْهَا (مغنی لابن ہشام ص۵۲۔ طبع بمبئی)

(۲) اس کا دوسرا استعمال یہ ہے کہ وہ زمانہ مستقبل کا اسم (تام) واقع ہو، مثلاً يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا لیکن جمہور نحات اس کو تسلیم نہیں کرتے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۳۔ تیسرا یہ کہ وہ کسی سابق معاملہ کی علت واقع ہو جیسے لَن یَّنفَعَکُمُ الیَومَ اِذ ظَّلَمتُم اَنَّکُم فِی العَذَابِ مُشتَرِکُونَ۔ لیکن جمہور اسے بھی تسلیم نہیں کرتے۔

۴۔ چوتھا استعمال یہ ہے کہ "مفاجات" (اچانک، ناگاہ) کے معنی میں مستعمل ہو اور یہ عموماً بینا یا بینما کے بعد واقع ہوتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے مغنی ابن ہشام کا مطالعہ فرمائیں۔ یہ تفصیل ہم نے صرف اس لیے پیش کی ہے کہ اس کا استعمال کثرت سے آتا ہے۔

(۵) اِستَسقیٰ (پانی مانگا) دوسرے مقام پر آتا ہے کہ بنی اسرائیل (قوم موسیٰ) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی مانگا تھا۔

اِذِ استَسقٰهُ قَومُهٗ (اعراف-ع) جب قوم موسیٰ نے ان سے (پینے کو) پانی مانگا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے پانی کے لیے درخواست کی تھی، اس لیے یہاں فرمایا۔

وَاِذِ استَسقٰى مُوسٰى لِقَومِهٖ (بقرہ ع)

اس کی تصریح کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرت طیبہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اللہ سے اپنی ذات کے لیے مادی ضرورتوں (کام و دہن کی تواضع) کی چیزوں کی کم ہی درخواستیں کی ہیں، الا یہ کہ ان کا تعلق دین کی اشاعت اور ترقی سے ہو یا امت کی جائز خواہش اور ضرورت کا تقاضا ہو۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہ پیشکش کی کہ اگر آپ چاہیں تو وادیٔ بطحا کو آپ کے لیے سونا بنا دیا جائے تو آپ نے عرض کی، حضور! مجھے یہ نہیں چاہیے، بس کبھی سیر اور کبھی بھوکا۔ بس اتنا ہی دیجیے۔ قال رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم:۔

عَرَضَ عَلَیَّ رَبِّی لِیَجعَلَ لِی بَطحَاءَ مَکَّۃَ ذَهَبًا فَقُلتُ یَا رَبِّ! وَلٰکِن اَشبَعُ یَومًا وَ اَجُوعُ یَومًا الحدیث (ترمذی)

الا یہ کہ جسم و جان کے رشتے کو باقی رکھنے کا کوئی شدید داعیہ پیدا ہو جائے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں آتا ہے کہ پیٹ بھوک سے پشت سے جا لگا تھا پھر دعا کی۔

رَبِّ اِنِّی لِمَا اَنزَلتَ اِلَیَّ مِن خَیرٍ فَقِیرٌ (پ۔ قصص ع)

قَالَ ابنُ عَبَّاسٍ: سَارَ مُوسٰی مِن مِصرَ اِلٰی مَدیَنَ لَیسَ لَهٗ طَعَامٌ اِلَّا البَقلُ وَ وَرَقُ الشَّجَرِ وَکَانَ حَافِیًا فَمَا وَصَلَ اِلٰی مَدیَنَ حَتّٰی سَقَطَت نَعلُ قَدَمَیهِ وَجَلَسَ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فِی الظِّلِّ وَھُوَ صَفْوَۃُ اللہِ وَاَنَّ بَطْنَہٗ لَلَاحِقٌ بِظَھْرِہٖ مِنَ الْجُوْعِ ...... وانہ لمحتاج اِلٰی شِقِّ تَمْرَۃٍ (ابن کثیر)

اگر مادی ضرورتیں اور چیزیں یادِ خدا سے غافل ہونے کا سبب بن جائیں تو ان کو ختم کیے بغیر دم نہ لیتے۔ دلکش گھوڑوں کے نظارہ میں کھو کر جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے یادِ خدا میں اضمحلال محسوس کیا تو اس "ذریعہ" کو اڑا ہی دیا۔

رُدُّوْھَا عَلَیَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (پ ۲۳-ص ع ۳)

۳۔ اِضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (اپنی لاٹھی کو پتھر پر مار) سرزمین مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کا قافلہ بیابانوں میں پہنچا تو وہاں کھانے کو کچھ تھا نہ پینے کو، سایہ تھا نہ کوئی آبادی، اس پر لیے رو کے اور چلائے اور لگے فرمائشیں کرنے، ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ ہمیں پانی چاہیے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے رب سے درخواست کی کہ الٰہی مجھے اپنی قوم کے لیے پانی چاہیے! اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان کو جواب دیا کہ اپنے عصا (لاٹھی) کو پتھر (چٹان) پر ماریے۔

وَاَوْحَیْنَا اِلٰی مُوْسٰی اِذِ اسْتَسْقٰہُ قَوْمُہٗ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ (پ ۹- اعراف ع ۲۰)

بس پھر کیا تھا: عصا کا مارنا تھا کہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْہُ اثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا ط

سورۂ اعراف میں "فَانْفَجَرَتْ" کے بجائے "فَانْبَجَسَتْ" آیا ہے۔ دونوں میں صرف کیفیت کا فرق ہے۔ "فَانْبَجَسَتْ" سے مراد وہ ابتدائی صورت ہے جب پانی رسنے لگتا ہے اور انفجرت سے مراد وہ پانی ہے جو نکل کر کشادہ ہو جاتا ہے۔

ضرب کلیمی سے چٹان یا پتھر سے پانی کے چشموں کا جاری ہو جانا پیغمبرانہ ایک معجزہ اور رب کی طرف سے ایک مافوق ذرہ نوازی ہے۔ کچھ حضرات کا خیال ہے کہ پتھر یا لاٹھی پر پتھر مارنے سے پانی کے چشمے نہیں بہ نکلے تھے بلکہ وہاں پہاڑی کے کسی گوشے میں پانی پتھروں کی تہوں میں موجود تھا جسے لاٹھی سے کرید کر اور ٹٹول کر نکالا گیا ہم اس کا بارہ چشموں کی صورت میں معجزانہ طور پر جاری ہو جانا کیوں مستبعد نہیں؟

دراصل انھوں نے "عصائے موسیٰ" کی ماہیت اور خصائص کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اصل میں وہ لاٹھی بکریوں کے ایک چرواہے یا گدھے ہانکنے والے کسی کمہار کی لاٹھی نہیں تھی وہ "موسوی عصا"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


تھا اور ہاتھ بھی "ید بیضا" تھا، اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اپنے "برہان" کا نام دیا ہے۔

فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَاۡئِهٖ (پ ۲۰ - قصص ع ۴)

برہان وہ سچائی اور حقیقت ہوتی ہے جو ہٹ دھرم کے سوا سب کے لیے وجہ اطمینان ہوتی ہے۔ یہ وہی عصائے موسیٰ ہے جس سے صرف پانی کے چشموں کا ظہور ہی نہیں ہوا۔ بلکہ دریا کو بھی چیر ڈالا تھا۔

فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ (پ ۱۹ - الشعراء ع ۴)

(ترجمہ) پھر ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنی لاٹھی دریا پر دے مارو، چنانچہ دریا پھٹ (کر ٹکڑے ٹکڑے ہو) گیا اور ہر ایک ٹکڑا گویا کہ بڑا (اونچا) پہاڑ تھا۔

پتھر، اس سے پانی نکلنے اور اسی سلسلے کی بعض دوسری تفصیلات بھی مفسرین نے بیان کی ہیں، جن کو ہم صرف "بزرگانہ باتیں" کہہ سکتے ہیں۔ علم اور حقائق سے بہت کم تعلق ہے اس لیے وہ بیان نہیں کی گئیں۔

؎ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (بارہ چشمے) یہ بارہ چشمے کیوں بنائے گئے ؟ صرف اس لیے کہ بنی اسرائیل بارہ قبیلوں پر منقسم تھے یا بغیر کسی امتیاز کے عوام کی سہولت کے لیے ؟ ہمارے نزدیک دونوں ممکن ہیں لیکن جمہور کے نزدیک پہلا احتمال قوی تر ہے۔

اُنَاسٌ سے مراد طائفہ اور قبیلہ ہے تو پہلا احتمال قوی ہے، اگر اس سے مراد صرف "لوگ" ہیں تو پھر ہمارے نزدیک دوسرا احتمال راجح ہے۔

قبائل کی صورت میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی حیثیت کا لحاظ رکھنا مناسب ہوتا ہے۔ حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اَلنَّاسُ مَعَادِنُ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْاِسْلَامِ اِذَا فَقُهُوْا (رواہ مسلم)

(ترجمہ) سونے چاندی کی کانوں کی طرح لوگ بھی کانیں ہیں، زمانہ جاہلیت میں جو لوگ بھلے تھے، اسلام میں بھی وہ بھلے ہیں جب کہ وہ دینی سوجھ بوجھ پیدا کر لیں۔

اگر صرف لوگ مراد ہوں تو مساوات شرعی ثابت ہوتی ہے کہ بلا امتیاز رفاہی امور میں سب کے لیے یکساں دروازے کھلے ہونے چاہئیں۔


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ
(اور) سب لوگوں نے (اپنا) اپنا گھاٹ معلوم کر لیا (اور اذنِ عام ہو گیا کہ) اللہ کی (دی ہوئی)

اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاِذْ قُلْتُمْ
روزی کھاؤ اور پیو اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اور (اور وہ وقت بھی یاد کرو) جب

يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ
تم نے (حضرت موسیٰ سے) کہا کہ اے موسیٰ! ہم سے تو ایک کھانے پر نہیں رہا جاتا تو آپ

يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّاۗىِٕهَا
ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے کہ زمین سے جو چیزیں اگتی ہیں یعنی ترکاری اور ککڑی اور

وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۭ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ
گیہوں اور مسور اور پیاز (من و سلویٰ کی جگہ) ہمارے لیے پیدا کرے (حضرت موسیٰ نے) کہا کہ جو چیز

---

ٹہ مُفْسِدِيْنَ (فساد کرنے والے) اس سے مراد تخریب اور فساد پھیلانا ہے۔ "عثی" بھی فساد ہے مگر شدید تر۔ غرض یہ ہے کہ خدا کا کھا کر نفس و طاغوت کا گانا سب سے بڑی تخریب ہے چنانچہ دوسرے مقام پر اس مضمون کو یوں دہرایا ہے۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ۭ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ ۱۱۔ یونس ع ۴)

"(ان سے اتنا تو پوچھو کہ تم کو آسمان و زمین سے کون روزی دیتا ہے اور (تمہارے) کان اور آنکھیں کس کے قبضہ میں ہیں؟ اور وہ کون ہے جو زندے کو مردے سے نکالتا ہے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے! اور کون (کارگاہ ہست و بود کا) انتظام چلا رہا ہے تو وہ بول اٹھیں گے کہ اللہ! اب آپ ان سے فرمائیں کہ کیا تم اس پر بھی (اس سے) نہیں ڈرتے۔"

رسول کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسے یوں بیان فرمایا ہے۔


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ بَرَكَةٍ اِلَّا اَصْبَحَ فَرِيْقٌ مِّنَ النَّاسِ بِهَا كَافِرِيْنَ، يُنَزِّلُ اللّٰهُ الْغَيْثَ فَيَقُوْلُوْنَ بِكَوْكَبِ كَذَا وَكَذَا (مسلم)

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ آسمان سے کوئی بھی برکت نازل کرتا ہے تو لوگوں کا ایک گروہ اس سے کفر کرنے لگ جاتا ہے، بارش اللہ نازل کرتا ہے اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ فلاں فلاں ستارے کی تاثیر سے مینہ برسا۔

مَا اَحَدٌ اَصْبَرُ عَلٰى اَذًى يَسْمَعُهُ مِنَ اللّٰهِ يَدْعُوْنَ لَهُ الْوَلَدَ ثُمَّ يُعَافِيْهِمْ وَيَرْزُقُهُمْ (بخاری و مسلم)

(ترجمہ) اللہ سے زیادہ صابر کوئی نہیں کہ وہ سنتا ہے، اللہ کے لیے بیٹے اور چہیتے ثابت کرتے ہیں (اس کے باوجود) پھر وہ ان کو عافیت بھی دیتا ہے اور روزی بھی۔

لَنْ نَّصْبِرَ (ہم بالکل نہیں رہ سکتے، مطلق صبر نہیں کر سکتے۔ قطعاً سکت نہیں رکھتے) من سلویٰ کھا کھا کر اکتا ہی گئے اور بول اٹھے کہ ہم اس سے تنگ آ گئے ہیں۔ ہمیں اب فلاں شئے ملنی چاہیے!

جہاں تک اکتا دینے والی بات ہے، بری نہیں ہے بلکہ یہ بالکل فطری بات ہے اور نہ قرآن نے اس پر ان کو ٹوکا ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ: ان منگتوں کو عادت سی ہو گئی تھی کہ وہ جو چاہیں، ان کو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر من وسلویٰ کی طرح ملے۔ اور ملتا رہے دوسرا یہ کہ: انھوں نے یہ بھی خواہش کی کہ من وسلویٰ کی نعمت واپس لے لی جائے، ان کی جگہ فلاں فلاں چیز ان کو دی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ناقدری کی باتیں ہیں، اگر من وسلویٰ کے ساتھ دوسری چیزوں کے لیے خود بھی ہاتھ پاؤں ہلا کر کچھ مہیا کر کے اپنے کام و دہن کا مزہ بدلتے رہتے تو ان کو کوئی بھی نہ ٹوکتا (اهبطوا مصرا فان لكم ما سألتم) مگر ان کا اصرار یہ تھا کہ تھوم وغیرہ بھی من وسلویٰ کی طرح بغیر محنت کے ملے۔ (فادع لنا ربك يخرج لنا مما تنبت الارض)

دوسری بات بھی بڑی نادانی کی بات تھی، چاہیے تو یہ تھا کہ ان کے ساتھ کچھ اور بھی مطالبہ کر دیتے۔ مگر جو ہوا ناقدر دانوں اور نادانوں کی طرح ہوا کہ اپنا یہ پالن دان اٹھا لو اور ہمیں فلاں فلاں چیز اس کے بدلے میں لا کر دے دو۔ (اتستبدلون الذی هو ادنی بالذی هو خیر) ظاہر ہے ایسا رویہ کسی معقول اور انعام و اکرام کی مستحق جماعت کا نہیں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ۭ اِھْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ

بہتر ہے کیا تم اس کے بدلے میں ایسی چیز لینی چاہتے ہو جو گھٹیا ہے؟ (اچھا تو) کسی شہر

لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ۭ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ

میں اتر پڑو کہ جو مانگتے ہو (وہاں) تم کو ملے گا اور ان پر ذلت اور محتاجی لیس دی گئی اور

وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ

وہ خدا کے غضب میں آگئے۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار اور پیغمبروں

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ

کو ناحق قتل کیا کرتے تھے (اور نیز) یہ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی

بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝

کی اور حد سے بڑھ (بڑھ) جاتے تھے۔

---

ہو سکتا۔ اس لیے ایسا معاشرہ اور ایسی قوم جو محنت سے بھی جی چراتی ہو، اس قدر جذباتی بھی ہو جو تھوڑی سی نفسیاتی تحریک پر جذباتی ہو جاتی ہو، ساتھ ساتھ قدر ناشناس بھی ہو وہ کیسے فلاح پا سکتی ہے۔

ثہ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ (کیا تم بدلتے ہو؟) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خدا سے مزید کچھ نہیں مانگا تھا بلکہ انعامِ الٰہی کو ٹھکرا کر اس کے بدلے میں کچھ اور چاہا تھا۔ یہ بات جہاں ان کی کور ذوقی کی علامت ہے وہ وہاں مالک اور محسن کے سلسلے میں ان کے گستاخانہ رویہ کی غماز بھی ہے۔

ثہ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ (تمھارے لیے وہ جو تم نے چاہا) فرمایا اگر مسور اور پیاز جیسی چیزیں چاہتے ہو تو جا کر خود کاشت کرو اور کھاؤ پیو۔ کیونکہ ایسی چیزوں کے لیے آسمانی خوانِ نعمائ کی تلاش نہیں، جو وہ خود پیدا کر سکتے ہیں، "دوں ہمت" قوم کی انتہائی "دوں ہمتی" کی بات ہے، ان کو مصر سے نکل کر ایک فاتح قوم کی حیثیت سے ابھرنا چاہیے تھا لیکن جو قوم مسور اور پیاز جیسی چیزیں نہیں پیدا کر سکتی ان سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اقوامِ عالم پر فتحیاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو کر اپنی ایک نئی دنیا تعمیر کر سکے گی۔ قَالُوا يٰمُوسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا (مائدہ ع۴)

لہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (ان پر ذلت اور محتاجی لیس دی گئی) یعنی پھر تو تم ذلیل و خوار ہی ہو گئے۔ کیونکر جو قوم دوں ہمت ہو گی اس کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ غور فرمائیے کہ ایک ایسی قوم جو محنت سے جی چراتی ہو، اس قدر جذباتی بھی ہو کر تھوڑی سی نفسانی تحریک پر جذباتی ہو جاتی ہو، ساتھ ساتھ قدر ناشناس بھی ایسی کہ مالک اور محسن حقیقی کے سلسلہ میں امتنان و تشکر کی توفیق سے بھی تقریباً تقریباً محروم ہو، جو خدا سے یہ بھی توقع رکھتی ہو کہ اسے ان کے پیچھے چلنا چاہیے، اپنے انبیاء کو اپنے گھر کی مچھلی سمجھتے ہوں، عظیم مشاہدات کے باوجود جن کی آنکھوں میں جلا نہ پیدا ہو سکے، آیاتِ الٰہیہ کا انکار (یکفرون بآیت اللہ) قتل انبیاء اور سینہ زوری (يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ) جن کی زندگی کے جلی عنوان ہوں اور اپنی ان شرمناک دھاندلیوں کے باوجود اس خوش فہمی میں مبتلا بھی رہتی ہو کہ: وہ خدا کے چہیتے، لاڈلے اور شہزادے بھی ہیں (نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ) تو ایسی قوم اگر ذلت و نکبت اور ادبار کا گہوارہ بن کر رہ جائے تو کونسی اچنبھے کی بات ہے یہ محرومیاں تو ان پر مسلط نہیں کی گئیں بلکہ وہ خود ان کے خمیر کے اندر سے اٹھی ہیں بلکہ ان کے قومی مزاج اور سرشت کی زمین ہی ایسی تھی کہ اس سے گل و لالہ کے بجائے محرومیوں کے خار اور تھوہر ہی اُگ سکتے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ الآیۃ۔

لہ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (کفر کرتے تھے، انکار کرتے تھے، اپنی کرتے تھے) کفر کی متعدد شکلیں ہیں، انکارِ حق اصلی کفر ہے، کتمانِ حق یعنی حق کو حق جانتے ہوئے چھپانا یا مرضی اور ذاتی خواہش اور مفاد کے مطابق ہو تو ماننا ورنہ نہیں۔ آیاتِ الٰہی کا کاروبار، حق اور باطل میں باہم آمیزش، کتمانِ حق، غیر اللہ کی پوجا، استحقاق سے زیادہ مدارج کے مطالبے پر اڑ جانا، تحریف، خدا پر افتراء، دین کو خاندانی جائیداد بنا لینا، اگر حق کہیں اور ثابت ہو جائے تو نہ ماننا، اور مجموعی لحاظ سے پوری قوم میں ایک طبقہ ایسا موجود رہنا جو عہد کے باوجود، عہد شکنی پر کمربستہ رہے تو وہ طبقہ بھی منکرِ حق شمار ہو گا؛ انکار کے بجائے طاغوت کی طرف رجوع کرنا اور ان کے فیصلوں پر قناعت کرنا، یہ سب کفر کی شکلیں ہیں، اس سلسلے کی قرآنی تصریحات پہلے گزر چکی ہیں۔


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



**۱۱۔ یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ** (اور نبیوں کو قتل کیا کرتے تھے)

قتل کے حقیقی معنی "جان سے مارنے" کے ہیں یا مجازی معنی انبیاء کی دعوت کو بے اثر کرنے کے لیے جد و جہد کرنے کے ہیں؟ ہمارے نزدیک یہاں اس کے حقیقی معنی مراد ہیں، کیونکہ یہاں حقیقی معنی متعذر نہیں ہیں، قرآن و حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

**قرآن حکیم**

فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ (پ۱۔ بقرہ ع۱۱)

"پھر بعض کو تم نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو تم قتل کرتے تھے۔"

تکذیب انہی مساعی سیئہ کا نام ہے جو دعوتِ انبیاء کو بے اثر اور ناکام کرنے کے لیے انجام دی جاتی ہیں، اس کے بعد کہا کہ ایک گروہ کو تم قتل کرتے رہے ہو۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا مفہوم ایک نہیں ہو سکتا، پہلے کا جو ہے وہ دوسرے کا نہیں ہے، جو دوسرے کا ہے وہ پہلے کا نہیں ہے۔ لازماً یہی تصور کیا جائے گا کہ تکذیب کے بعد قتل کا ذکر حقیقی معنوں میں آیا ہے۔

**روایات**

حضرت ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ حضورؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت میں سب لوگوں سے زیادہ سخت عذاب اس شخص کو ہوگا جس کو نبی نے قتل کیا ہوگا یا جس نے نبی کو قتل کیا ہوگا۔

حدثنا عبد الصمد حدثنا ابان حدثنا عاصم عن ابی وائل عن عبد اللہ یعنی ابن مسعود ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم قال اَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ رَجُلٌ قَتَلَهٗ نَبِیٌّ اَوْ قَتَلَ نَبِیًّا و امام ضلالۃ و ممثل من الممثلین (ابن کثیر ص۱۰۳ بحوالہ احمد)

اس روایت نے قتل انبیاء کے امکان کو ثابت کر دیا ہے جو لوگ اس کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اس کو شرعاً ناممکن تصور کرتے ہیں۔ بہر حال قتل انبیاء شرعاً ناممکن نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے بھی اس امکان کو تسلیم کیا ہے وہ فرماتے ہیں واللہ لئن مات او قتل لا قاتلن علی ما قتل علیہ (رواہ الطبرانی والحاکم) خود قرآن نے اس امکان کی طرف اشارہ کیا ہے: اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ (آل عمران) اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ان کا قتل بھی ہوا یا نہیں؟ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ ہوا! ذیل کی روایات ملاحظہ فرمائیں۔

ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت آئی ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک ہی دن میں تین سو نبی قتل کیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قال ابو داؤد الطیالسی حدثنا شعبۃ عن الاعمش عن ابراہیم عن ابی معمر عن عبد اللہ بن مسعود قال کانت بنو اسرائیل فی الیوم تقتل ثلثمائۃ نبی (ابن کثیر ص۱۰۴) وفی روایۃ ابن جریر: قتلت بنو اسرائیل ثلثمائۃ نبی من اول النہار (ابن کثیر ص۳۵۵)

حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح سے مرفوعاً روایت ہے کہ:

بنی اسرائیل نے دن چڑھے ایک ہی ٹائم میں (۴۳) نبی اور پچھلے پہر اُن (۱۷۰) صلحاء کو قتل کر ڈالا تھا، جنھوں نے ان کو تبلیغ کی تھی:

یا ابا عبیدۃ قتلت بنو اسرائیل ثلثۃ واربعین نبیا من اول النہار فی ساعۃ واحدۃ فقام مائۃ وسبعون رجلا من بنی اسرائیل فامروا من قتلہم بالمعروف ونہوہم عن المنکر فقتلوہم جمیعا من اٰخر النہار من ذلک الیوم (ابن کثیر ص۳۵۵ بحوالہ ابن ابی حاتم)

اکثر مفسرین اور مؤرخین نے بھی بنی اسرائیل کے قتل انبیاء کو تسلیم کیا ہے۔ بعض مفسرین نے ان کا نام بھی لیا ہے مثلاً شعیا، زکریا، یحییٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

صحفِ آسمانی میں بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً:

"تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند، تمہارے نبیوں کو کھا گئی (تواریخ ۲۰) نحمیا میں تصریحاً آیا ہے کہ: اور تیرے نبیوں کو، جو نصیحت دیتے تھے کہ انھیں تیری طرف پھرلائیں، قتل کیا (نحمیا)

دورِ حاضر میں "قتل انبیا" کے منکروں میں مرزائی لوگ سب سے زیادہ پیش پیش ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں سے بھی کچھ حضرات نادانستہ طور پران کے بھرے میں آگئے ہیں جو سرتاپا غلط ہے۔

۲۱ وَكَانُوا يَعْتَدُوْنَ (اور وہ حد سے بڑھ بڑھ جاتے تھے) جو لوگ حدود کو پھاند جانے میں بیباک ہوتے ہیں، وہی لوگ بدی کی انتہا تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ گو شروع میں حدود شکنی ابتدائی قسم کی محسوس ہوتی ہے لیکن بالآخر بتدریج وہ چھا جاتی ہے، حدیث میں اس تدریج کا ذکر یوں آیا ہے کہ ابتدا میں دل پر ایک سیاہ نقطہ پیدا ہوتا ہے اگر توبہ کر لیتا ہے تو وہ صاف ہو جاتا ہے ورنہ سارے دل پر چھا جاتا ہے۔



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

إِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا أَذْنَبَ كَانَتْ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فِي قَلْبِهِ فَإِنْ تَابَ وَاسْتَغْفَرَ صُقِلَ قَلْبُهُ وَإِنْ زَادَ زَادَتْ حَتّٰى تَعْلُوَ قَلْبَهُ (ترمذی)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ:

گناہ کے صدور پر مومن تو یوں محسوس کرتا ہے جیسے پہاڑ اس کے سر پر آ گرے گا، مگر گنہگار انسان یوں محسوس کرتا ہے جیسے ناک پر مکھی آ بیٹھی اور اسے ہاتھ سے اڑا دیا۔

ان المومن یری ذنوبه کأنه قاعد تحت جبل یخاف ان یقع علیه وان الفاجر یری ذنوبه کذباب مر علی انفه فقال به هکذا ای بیده فذبه عنه (مسلم)

یہ فاجر وہی شخص ہوتا ہے جو گناہوں کی حد تک ان جھک ہو جاتا ہے اور یہ بات دفعتہً پیدا نہیں ہوا کرتی بلکہ بتدریج یہ ملکہ راسخ ہوتا ہے۔ جب اس میں کوئی راسخ ہو جاتا ہے تو پھر بڑے سے بڑا گناہ بھی اس کی زد میں رہتا ہے۔

وَالْآخَرُ أَسْوَدُ مُرْبَادًّا كَالْكُوزِ مُجَخِّيًا لَا يَعْرِفُ مَعْرُوفًا وَلَا يُنْكِرُ مُنْكَرًا إِلَّا مَا أُشْرِبَ مِنْ هَوَاهُ (مسلم)

یعنی دوسرا دل، راکھ سا سیاہ جیسے الٹا کوزہ جو نیکی اور بدی کے احساس سے بالکل خالی، وہ صرف اس چیز کا احساس کرتا ہے جو اس کے نفس میں رچ بس گئی۔

اس لیے حضورؐ نے بالخصوص چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی بچتے رہنے کی سفارش کی ہے:

إِيَّاكَ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوبِ (ابن ماجہ)

کیونکہ چنگاری سے آتشکدے بنتے ہیں بہرحال حدود اللہ کی پامالی کا اگر شروع میں احساس نہ کیا جائے تو انسان کفر و طغیان کی انتہاؤں تک پہنچ کر دم لیتا ہے۔

## فقہ القرآن

۱۔ صلحاء سے درخواست دعا مناسب ہوتی ہے، خواہ روحانی مقاصد کے لیے ہو یا جائز دنیوی مصالح کے لیے وَإِذِ اسْتَسْقٰى مُوسٰى لِقَوْمِهِ (بقرہ ع ۷) إِذِ اسْتَسْقَاهُ قَوْمُهُ (اعراف ع ۲۰)

۲۔ معجزات اور کرامات برحق ہیں۔ فانفجرت منه اثنتا عشرة عینا۔

۳۔ خدا کا عطا کردہ رزق بافراغت کھانا، روحانیت کے منافی نہیں ہے الا یہ کہ کوئی جانوروں کی طرح جُتے تاکہ کھائے۔ کلوا واشربوا من رزق اللہ۔


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۴۔ ایسا رزق جس سے تعمیر کے بجائے تخریب کے سوتے پھوٹ پڑیں پسندیدہ نہیں ہے۔
ولا تعثوا فی الارض۔

۵۔ خدا کی عنایات سے اعراض مضر ہے الا یہ کہ ان کے ساتھ مزید کے لیے سعی و کوشش کرے۔ قال اتستبدلون۔

۶۔ مفت کے من وسلویٰ کے انتظار میں نہ رہے بلکہ خود بھی ہاتھ پاؤں ہلائے۔
اھبطوا مصرا فان لکم ما سالتم۔

۷۔ عملاً یا اعتقاداً آیاتِ الٰہی سے گریز اور داعیانِ دینِ برحق کے خلاف سازشوں کے جال بچھانا خطرناک ہے، وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔ ذلک بانھم کانوا یکفرون بآیٰت اللہ ویقتلون النبیین بغیر الحق۔

۸۔ صغائر پر اصرار کے نتائج سخت سنگین اور خطرناک برآمد ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس سے کبائر اور طغیان کے دروازے کھل جاتے ہیں جو بالآخر لے ڈوبتے ہیں، دنیا یا آخرت یا دونوں۔ ذلک بما عصوا وکانوا یعتدون۔

---

# عشق کی سربلندی

اسرار احمد سہاوری

مُدّعی آج چشمِ پُرنم ہے: التفات اس کا باعثِ غم ہے
عشق کی سربلندیاں ہر سو! ہوں مبارک، ہوس کا سر خم ہے
اہلِ دل کو خوشی مبارک ہو بوالہوس آج محوِ ماتم ہے
ہو گیا گم خلاؤں میں جا کر کیسی تقدیر ابنِ آدم ہے
رشتۂ غم بہ فیضِ لطفِ خدا ان دنوں دل سے خوب محکم ہے
یاد سے اس کی دل نہیں خالی ذکر اس کا لبوں پہ ہردم ہے
راہ سیدھی نہیں ہے منزل کی ہر جگہ اس میں پیچ اور خم ہے
ہو ہی جائے گا فاصلہ بھی طے!
یاد اس کی ہماری ہمدم ہے


© rasailojaraid.com